سلطان العلماء
سمیٔ ختم رسل قبلۂ ملک آداب

فاضل نبیل جناب چودھری سبط محمد نقوی صاحب

سے ہم عاجز ہیں۔

شمالی ہند میں تشیع کا احیاء غفراں مآب مولوی دلدار علی صاحب کا تاریخی کارنامہ ہے جو آپ نے نواب آصف الدولہ اور ان کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی توجہ سے انجام دیا لیکن آپ کے فرزند اکبر اور جانشین مولوی سید محمد کو حالات نے زیادہ عہد آفریں شخصیت ثابت کیا۔ آپ علمی دنیا میں سلطان العلماء کے شاہی خطاب سے مشہور ہوئے۔ دربار میں بہ اتباع شاہی قبلہ وکعبہ اور گھر میں بڑے آپ کہے جاتے تھے۔

(تاریخ سلطان العلماء ص ۱۱)

عہد امجد علی شاہ اور بعد کی تاریخ میں مجتہد العصر اور بعد وفات رضواں مآب کے لقب سے یاد کئے گئے۔

ولادت :۔ مولوی سید دلدار علی نے اپنے سب سے بڑے فرزند کی ولادت سے قبل (جو ۱۷؍صفر ۱۱۹۹ھ وا وائل ۱۷۸۴ء کو واقع ہوئی)۔ خواب میں دیکھا کہ ''حضرت حجتؑ (بارہویں امام) عجل اللہ ظہورہ فرماتے ہیں کہ اس مولود کی تربیت مجھ سے متعلق ہے۔'' اسی بناء پر آپ فرمایا کرتے تھے کہ ''مجھے فخر حاصل ہے اور میں بجا طور پر کہتا ہوں کہ امام منتظرؑ میری پرورش کے کفیل ہوئے ہیں۔'' (تاریخ سلطان العلماء ص ۲)

تعلیم و تربیت :۔ مصنف تاریخ سلطان العلماء کا فرمانا ہے کہ ایسے علماء کم ہوں گے جنہوں نے صرف اپنے والد ماجد سے تحصیل علم کی ہو۔

(تاریخ سلطان العلماء ۱۷)

جناب مصنف کی حیثیت خاندان اجتہاد میں ''اہلبیت'' کی ہے اور یقینا گھر کے حالات سے بہتر واقف ہوں گے۔ لیکن اسی کے ساتھ خاندان فرنگی محل میں اسی حیثیت کے مالک مصنف بانئ درس نظامی کا فرمانا ہے کہ...... مولانا سید دلدار علی نصیر آبادی کے فرزند مولانا سید محمد مجتہد نے مولانا حیدر علی سندیلوی سے پڑھا تھا۔''

(بانئ درس نظامی ص ۱۲۹)

ان متضاد بیانات پر محاکمہ فی الوقت میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ بہرکیف جناب نے تحصیل علم میں ایسی جانفشانی کا مظاہرہ کیا کہ ۱۹ سال کی عمر میں تکمیل تحصیل ہوگئی اور مجسمہ علم وکمال باپ نے اس لائق پایا کہ اجازۂ اجتہاد عطا کریں۔

والد کے شریک کار :۔ اجازۂ اجتہاد سے مزین ہونے کے بعد آپ نے اپنے والد ماجد کی ذمہ

داریوں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا اور یہ چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں آپ کا اشتغال تھا۔ اگر چہ اپنے پانچوں فرزندوں کی تعلیم کی اساس خود غفرانمآبؒ قائم کر چکے تھے مگر چار بھائیوں کی تکمیل سلطان العلماء کی مجلس درس میں ہوئی۔ چنانچہ خود حضرت سید العلماء اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں...... ہم نے اور ان کی سب اولاد نے سلطان العلماء ہی کے انوار علوم سے فائدے اٹھائے (تاریخ سلطان العلماء ص ۲۷) سید العلماء مولانا سید حسین، آپ کے سب سے چھوٹے بھائی تھے جو آپ کے برابر کے شریک کار و معاون رہے۔ مولانا آغا مہدی صاحب مصنف تاریخ سلطان العلماء جو سید العلماء کی چوتھی پشت میں ایک ذی علم اور بالغ نظر مصنف ہیں۔ سلطان العلماء کو اعلم سمجھتے ہیں اسی نقطۂ نظر کی وکالت موصوف نے اپنی تصنیف تاریخ سلطان العلماء میں فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو سلطان العلماء کی اعلمیت ص ۲۳ مگر مفتی میر عباس شوشتریؒ جو سید العلماء کے جید تلامذہ میں ہیں اور جنہیں اس دودمان ہدایت نشان سے بڑی قربت، حالات کی گہری واقفیت اور خود سلطان العلماء سے زبردست عقیدت تھی۔ سید العلماء کی مدح میں کہتے ہیں۔ ؎

امامیکہ در کشور اجتہاد　　چو او مادر دہر ہرگز نہ زاد

اور یہ بہت بڑی اور معاصر شہادت ہے۔ خاندان اجتہاد کے موجودہ سربراہ جو سلطان العلماء کے منجھلے (چوتھے) بھائی سید مہدیؒ کی نسل میں ہیں یعنی مولانا الحاج سید کلب عابد صاحب، آپ نے بھی ایک گفتگو میں یہی بتایا کہ اعلمیت و افقہیت جناب سید العلماء کے لئے تھی۔ یہی اعلم زمانہ سلطان العلماء سے اپنے استفادہ کا ذکر فرماتے ہیں:۔

''میں نے اپنی تعلیم کی ابتداء اور انتہا دونوں میں، اپنے والد ماجد غفراں مآب کی خدمت میں پڑھا لیکن وہ جناب میرے دوران تعلیم علیل ہو گئے۔ جس کی وجہ سے میرا درس...... اخی معظم مجد اوحد جناب سید محمد...... کے حوالے کر دیا لہٰذا میں طویل مدت تک ان جناب کی خدمت میں علوم عربیہ میں معانی و بیان، بعض علوم حکمیہ و فنون رسمیہ اور بعض علوم دینیہ کی تحصیل میں مشغول رہا...... جب علامہ آفاق والد ماجد کو مرض سے افاقہ ہوا تو پھر میرا درس ان کے یہاں ہونے لگا۔

(مضمون نوشتہ راقم ماہنامہ الواعظ اگست ۱۹۷۴ء ص ۱۸)

دربار اودھ سے روابط:۔ آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کا زمانہ غفراں مآب کے سامنے گذرا اور قدردانی کے ساتھ۔ غازی الدین حیدر شاہ کے عہد سلطنت میں ۱۲۳۵ھ میں غفراں مآب نے رحلت فرمائی اسی دور سے زیر سطح بے چینی کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں صوبہ اودھ کی حیثیت جب تک خود مختار نہ تھی۔ فرماں روایان اودھ کے تصرفات صحیح تھے۔

جس وقت نوابی کا اختتام اور سلطنت کی بنیاد قائم ہوئی تو اس اقدام کے جواز کے سامنے سوالیہ نشان لگ گیا۔ پھر بھی غفراں مآب کا عہد بخیر و بخوبی گزرا۔ غازی الدین حیدر سے مولانا سید محمد کا تعلق بس واجبی سا رہا لیکن نصیر الدین حیدر شاہ کا دور آتے ہی کش مکش شروع ہوگئی۔

یہ روداد آپ خاندان اجتہاد کے ایک اور اہل قلم سید محمد باقر شمس لکھنوی کے قلم سے دیکھیں:۔

''غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلطان العلماء کی بڑی آؤ بھگت کی، ولیعہدی کے زمانے میں اپنی طرف مائل سمجھ کے۔ مگر تخت پر بیٹھتے ہی ان سے ٹکر ہو گئی۔ ایک عورت سے (جسے اس کا شوہر چھوڑ چکا تھا، مگر شرعی طور پر طلاق نہیں ہوا تھا) نکاح پڑھنے کے لئے طلب کیا انہوں نے صاف کہہ دیا کہ شوہر اول سے افتراق شرعی طورر پر ثابت نہیں، اس لئے میں نکاح نہیں پڑھوں گا بادشاہ کا چہرہ غصہ سے متغیر ہو گیا اور آپ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس کے بعد شراب کے جواز کا فتویٰ اس صورت سے چاہا کہ طبیب حاذق نے بادشاہ کی زندگی کا انحصار شراب میں تجویز کیا ہے۔ اس صورت میں حکم شرعی کیا ہے۔ تمام علمائے اسلام نے جواز کا فتویٰ دیا۔ سلطان العلماء جانتے تھے کہ اس بہانے شراب نوشی مقصود ہے جس طرح جان بوجھ کر طبیب حاذق کی غلط تجویز ہے اسی طرح مفتی کا فتویٰ غلط ہوگا۔ حقیقت تو یہی تھی مگر صورت مسئلہ میں طبیب حاذق کی رائے سے مخالفت مفتی کیلئے بے معنی ہے اس لئے انہوں نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیا اور لکھ دیا ''**لا شفاء فی الحرام**'' (حرام چیزوں میں شفا نہیں) ان سے پہلے کسی نے اس محل پر اس حدیث کو پیش نہیں کیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کی تند مزاجی مشہور ہے یہ دوسری جھڑپ تھی۔ اب رعب شاہی سے کام لینا چاہا اور ایک مسئلہ پوچھنے کے بہانے سے سلطان العلماء کو بلوایا۔ ایک کرسی پر خود بیٹھے اور ایک کرسی سامنے رکھوا کر اس پر قلمدان رکھ دیا اور ارادہ کیا کہ جب سلطان العلماء آئیں گے تو تعظیم نہ کروں گا۔ سلطان العلماء نے دروزاہ کے پاس پہونچتے ہی عربی قاعدے کے موافق بلند آواز سے یا اللہ کہا اور اندر داخل ہو گئے۔ بے اختیار بادشاہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور وہ قلمدان اٹھا کے بیٹھ گئے۔ بادشاہ دیر تک سناٹے میں رہے اور آخر میں ایک مسئلہ یوں ہی پوچھ کر رخصت کر دیا۔ جب مصاحبین خاص نے پوچھا تو کہا جب وہ کمرے میں آئے معلوم ہوا کسی نے بغلوں میں ہاتھ دیکر کھڑا کر دیا۔ مفتی میر عباس صاحب نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا کہ ان کے چہرے میں تنہا وہ رعب و جلال تھا جو بادشاہوں کو لشکروں کے ساتھ نصیب نہ تھا۔

اس واقعہ سے سلطان العلماء سمجھ گئے کہ بادشاہ کو مخالفت پیدا ہو گئی ہے اور وہ توہین پر آمادہ ہیں۔ دوسری دفعہ جب بلائے گئے تو جانے سے انکار کر دیا۔ نصیر الدین حیدر اس کی تاب کہاں لا سکتے تھے۔ آگ بگولہ ہو گئے حکم دیا کہ مکان توپ سے اڑا دیا جائے۔ شہر میں ہلچل مچ گئی رات کو یہ حکم ہوا تھا کہ بجلی کی طرح سارے شہر میں خبر دوڑ گئی۔ امرائے دربار دوڑے آئے کہ سلطان العلماء معافی مانگ لیں۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ رات لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی، صبح ہوئی، شاہی فوج کے کپتان نواب مقبول الدولہ نے توپ خانے سے دو توپیں نکلوائیں۔ ایک سلطان العلماء کے مکان پر چڑھ گئی دوسری

محلسرائے شاہی پر۔ صبح کو بادشاہ کی آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ شاہی محل پر توپ چڑھ گئی۔ حواس جاتے رہے پوچھا یہ توپ کیوں اور کس نے چڑھائی ہے؟ معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے کپتان نے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری غیرت قبول نہیں کرتی کہ بادشاہ دین کا مکان توپ سے اڑادوں اور بادشاہ دنیا کا محل کھڑا رہے۔ اس لئے میں اپنی دین ودنیا دونوں آج ختم کئے دیتا ہوں۔ احساس مذہبی نے بادشاہ کو چونکا دیا اور شرمندہ ہوکر اپنا حکم منسوخ کیا۔ کپتان کو ان کے جوش ایمانی پر گراں بہا خلعت عنایت کیا مگر سلطان العلماء سے زندگی بھر صفائی نہ رہی اگر چہ مذہبی امور کی انجام دہی انہیں کے ہاتھوں ہوتی رہی۔ (شیعیت کی تاریخ ۳۹۔ ۳۷)

محمد علی شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد حالات میں ہمواری پیدا ہوئی۔ محمد علی شاہ کا رجحان مزاج مذہب کی طرف تھا۔ اب امور خیر وخیرات کی طرف توجہ ہونے لگی اور احکام شرع کو گوش ہوش سے سنا جانے لگا۔ شمس صاحب اسی سلسلۂ بیان میں رقمطراز ہیں:۔

''انہوں نے جامع مسجد بنوائی اور سلطان العلماء سے نماز پڑھانے کی استدعا کی، انہوں نے کہا اس میں کچھ زمین نعیم خاں کی شامل ہوگئی ہے۔ اس لئے میں نماز نہیں پڑھاؤں گا۔ یہ بادشاہ نہایت متدین اور بیدار مغز تھے انہوں نے سلطان العلماء ہی کے سپرد اس کی تحقیقات کی اور کہا کہ شرعی حیثیت سے جواز کی صورت آپ نکال دیں انہوں نے نعیم خاں کو بلوا کے معاوضہ پر راضی کیا اور بادشاہ سے معاوضہ دلوا کے نماز پڑھائی۔'' (شیعیت کی تاریخ ۴۰)

یہ دور بادشاہ دنیا اور نائب امام کے تعاون اور ہم آہنگی سے گذرا۔ امجد علی شاہ نے تخت نشین ہو کے سلطنت کے جواز کو شک وشبہ سے بالاتر قرار دینے کے لئے یہ حل تجویز کیا کہ تخت سلطنت سلطان العلماء کو سونپ دیا جائے مگر قبلہ وکعبہ نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے تاج کو اپنے ہاتھ سے انکے سر پر رکھا اور عہد و پیمان لیا کہ حکومت فقہ جعفری کے نظام الٰہی پر ہو۔'' (تاریخ سلطان العلماء ۴۴)

بادشاہ نے ممکن حد تک عہد پورا کیا اور نظم ونسق کا رخ حکومت الٰہیہ کی طرف حتی الامکان ہوا۔ اس کی تفصیل بڑی حد تک آپ گذشتہ اوراق میں ملاحظہ فرما چکے۔ یہ واقعہ خود شاہد عادل ہے کہ سلطنت کن حالات میں سلطان العلماء کی طرف بڑھی۔

خطاب:۔ امجد علی شاہ نے قبلہ وکعبہ کے لئے حسب ذیل خطاب تجویز فرمایا تھا:

''مجمع علوم دین، مرجع سادات ومومنین، حافظ احکام اللہ، مورد اعتقادات امجد علی شاہ، سلطان العلماء مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب''

لیکن خود سلطان العلماء کی تجویز پر مورد اعتقادات کو مورد عنایات سے بدل دیا گیا۔

امجد علی شاہ اور سلطان العلماء کے روابط پر یہاں پھر سے اظہار خیال کی ضرورت نہیں، گذشتہ اوراق میں حسب ضررت بحث ہو چکی ہے۔ اب ہمیں سلطان عالم واجد علی شاہ سے سلطان العلماء کے روابط کو دیکھ لینا چاہئے۔ جناب شمس لکھتے ہیں:۔

''ولی عہد واجد علی شاہ پر ایک زن بازاری نے دعویٰ دائر کیا کہ وہ میری حضانت سے ایک لڑکی کو زبردستی لے گئے۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور فریقین کے ثبوت و بیان کے بعد فیصلہ ہوا کہ اس کی رقیت شرعی نہج سے ثابت ہوئی لہٰذا ولی عہد بہادر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً اس لڑکی کو مدعیہ کے سپرد کر دیں۔ واجد علی شاہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی اسی طرح کا ایک واقعہ یہ بھی تاریخوں میں موجود ہے کہ واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں کسی عورت کو اپنے تاہل میں لانا چاہا جو ان پر حرام تھی۔ فتویٰ پوچھا، جواب نفی میں ملا۔ جب بادشاہ ہوئے تو خیال ہوا کہ شاید اب مرعوب ہو جائیں۔ کہلوایا کہ کیا اس حکم پر نظر ثانی کی گنجائش ہے؟ سلطان العلماء نے جواب دیا کہ **حلال محمد حلال الیٰ یوم القیامة و حرام محمدؐ حرام الیٰ یوم القیامة** (شیعیت کی تاریخ ص ۵۵) (یعنی حضرت پیغمبر آخر الزماں نے جو چیزیں حرام یا حلال کر دی ہیں، اس میں قیامت تک تبدیلی نہیں ہوسکتی۔) چونکہ سلطان العلماء کا اصلی نام محمد تھا اس لئے الفاظ حدیث بہت پر معنی ہو گئے۔

انتزاع کے بعد:۔ واجد علی شاہ کے عہد میں بھی صورت حال برقرار رہی، بادشاہ کو علماء کرام کے احترام و اکرام کا خود بہت خیال رہتا تھا اور تمام نظم و نسق تقریباً اسی نہج پر رہا جو ان کے والد جنت مکان کے عہد میں تھا۔ انتزاع سلطنت کے بعد جب تحریک آزادی کی لہر آئی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان العلماء کو کسی ناگوار صورت حال کا سامنا ہوا۔ مولوی اعجاز حسین صاحب ابن مولوی مفتی محمد قلی صاحب نے لکھنؤ پہونچ کر تمام امور بخیر و بخوبی انجام کو پہونچائے۔ انگریزوں نے بھی قبلہ و کعبہ کی قدردانی سے کام لیا۔ حاضری عدالت اور اسلحہ کے لائسنس سے مستثنیٰ تھے، دربار میں کرسی بھی ملتی تھی، دربار اودھ سے جو معافی و مراعات تھی وہ بھی بحال کی گئی (تذکرۂ بے بہا ۸-۷)

علمی خدمات:۔ اگر چہ سلطان العلماء کے اوقات عزیز عدالتی فرائض اور دربار سے متعلق دوسرے امور میں بہت بڑی حد تک صرف ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے تصانیف و تلامذہ کی بڑی تعداد اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ آپ پہلے فرد تصنیفات ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ اجازۂ اجتہاد و روایت برائے ممتاز العلماء سید تقی صاحب مطبوعہ ۱۸۴٦ء
۲ اجازہ برائے عمدۃ العلماء سید ہادی صاحب قبلہ
۳۔ احیاء الاجتہاد ۔ اصول فقہ
۴۔ ازاحۃ الغی
۵۔ اصل الاصول
٦۔ بارقۂ ضیغمیہ
۷۔ کتاب مبسوط
۸۔ بوارق موبقہ
۹۔ برق خاطف
۱۰۔ بشارت محمدیہ
۱۱۔ ثمرۃ الخلافت
۱۲۔ حفاظ قرآن امامیہ
۱۳۔ حاشیہ حمد اللہ

۱۴۔رسالہ حل مسئلہ جذر اصم
۱۵۔حاشیہ شرح صغیر
۱٦۔رسالہ تحقیق نجاست عرق جنب بحرام
۱۷۔رسالہ ضیق ووسعت درنماز قضا
۱۸۔رسالہ جمعہ
۱۹۔سبع مثانی (تجوید میں)
۲۰۔سیف سح
۲۱۔سم الفار
۲۲۔شرح زبدۃ الاصول
۲۳۔صمصام قاطع
۲۴۔ضربت حیدریہ (دوضخیم مجلدات)
۲۵۔طعن الرماح
۲٦۔عجالہ نافعہ
۲۷۔فوائد نصیریہ
۲۸۔قتال النواصب
۲۹۔گوہر شاہوار
۳۰۔کشف الغطا
۳۱۔لوعلم ابوذر مافی قلب سلیمان
۳۲۔منہاج التدقیق
۳۳۔شرح جعفریہ محقق شیخ علی
۳۴۔تفضیل سادات بر مشائخ
۳۵۔اجازۂ شقشقیہ بحق ملک العلماء بندہ حسین
۳٦۔جوابات،سوالات علی بن شدقم
۳۷۔حاشیہ بر معالم الاصول
۳۸۔جدول ولادت ووفات ائمہ معصومینؑ
۳۹۔احقاق الحق: اسی نام کی ایک مشہور کتاب شہید ثالث نوراللہ شوشتریؒ کی بھی ہے مگر سلطان العلماء نے بھی اس نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔
۴۰۔تحریرات سلطان العلماء رام پور کے کتبخانے میں ہیں جن میں تاریخ اودھ اور انتزاع سلطنت پر بحث ہے۔

تلامذہ:۔ یہ ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ سلطان العلماء اپنے نامور چھوٹے بھائیوں اور بیٹوں کی تعلیم کے کفیل رہے ہیں۔ان کے علاوہ انہوں نے لاتعداد بچوں کی بسم اللہ بھی کرائی ہے۔ان کے علاوہ جن افراد نے ان کے سامنے باقاعدہ زانوئے ادب تہہ کر کے اکتساب علم و کمال کیا ہے ان میں سے جو نام معلوم ہو سکے ہیں وہ پیش کیے جارہے ہیں:۔

۱۔میرزا جعفر علی فصیح (تحقیقی نوادر ص ۲۰۰)
۲۔قاضی آغا سید صاحب جائسی
۳۔میر اولاد حسین صاحب
۴۔ قاضی محسن رضا صاحب ۔ صاحب تذکرۂ بے بہا (ص ۳۴۲) نے ان دونوں حضرات کوایک ہی شخص قرار دیا ہے صاحب تاریخ سلطان العلماء (ص ۱۵۸) انہیں الگ الگ فرد قرار دیتے ہیں اور آغا سید صاحب جائسی کا اصل نام محمد رضا بتاتے ہیں۔
۵۔مولوی سید شاہ بخاری
٦۔قاری سید جعفر علی جارچوی
۷۔مولوی سید دیدار جہاں محدث ۔ن بزرگوار کو صاحب

تاریخ سلطان العلماء نے بڑا گاؤں ضلع فیض آباد کا متوطن بتایا ہے۔ اور استاذی مولانا خادم حسین صاحب مرحوم کو ان کی اولاد دختری میں شمار کیا ہے۔

۸۔ مفتی سردار مرزا صاحب

۹۔ مولوی سید سرفراز حسین صاحب، مرزا غالبؔ اسی مناسبت سے ان بزرگ کو مجتہد العصر اور سلطان العلماء سے بطور مزاح یاد کرتے تھے۔ میر مہدی مجروحؔ کے نام کے خطوط میں ان کا ذکر بہت آیا ہے۔

۱۰۔ مولوی میر سید علی صاحب محدث

۱۱۔ مولانا سید علی حسن صاحب جائسی

۱۲۔ مولوی میر برکت علی صاحب

۱۳۔ مولانا سید حامد حسین صاحب فردوس مآبؒ

۱۴۔ مولوی مرزا محمد بن علی محمد فیض آبادی

۱۵۔ مولوی سید محمد صاحب

۱۶۔ مولوی مشرف علی صاحب

۱۷۔ مولوی عبد العلی صاحب

۱۸۔ مولانا سید ابوالقاسم قمی صاحب

۱۹۔ مولانا شاہ سید علی حسن اشرفی احسنؔ جائسی

ازواج و اولاد:۔ مولانا سید محمد کی شادی چودہ سال کی عمر میں اپنی خالہ زاد بہن دختر سید محمد صالح ابن سید ابوالفضل سے ہوئی۔ (دوحۂ ہاشمیہ قلمی کتبخانہ لور پور فیض آباد) ان کے علاوہ چھ بیویاں اور ہوئیں اور صاحب تاریخ سلطان العلماء کے بیان سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب امہات اولاد تھیں۔

گیارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں خدا نے دیں۔ (تاریخ سلطان العلماء ص ۱٦۹) صاحب تذکرۂ بے بہا کے بیان کے مطابق ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ منصف الدولہ سید محمد باقر صاحب

۲۔ مولوی سید محمد صادق صاحب

۳۔ خلاصۃ العلماء سید محمد مرتضیٰ صاحب

۴۔ مولوی سید عبداللہ صاحب

۵۔ ملک العلماء جناب بندہ حسن صاحب

٦۔ ڈپٹی مولوی سید علی اکبر صاحب

۷۔ تاج العلماء جناب سید علی محمد صاحب

۸۔ مولوی غلام حسین صاحب

۹۔ مولوی سید محمد علی صاحب

دو حضرات کا نام نظر سے نہیں گزرا۔

صاحبزادیوں کا نام معلوم ہونے کا تو امکان ہی نہیں ہے، وہ کہاں منسوب ہوئیں پیش نظر دو ماخذوں میں اس کا ذکر بھی نہیں ہے۔ تاریخ سلطان العلماء سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ سلطان العلماء کی ایک صاحبزادی، ان کے حقیقی برادر زادے سید ہادی صاحب خلف سید مہدی صاحبؒ سے منسوب تھیں۔ سلطان العلماء کی ایک صاحبزادی فاطمہ صغریٰ نصیر آباد بیاہ کر گئیں۔ ان کے بطن سے سید عسکری صاحب پیدا ہوئے۔ ان کو سید العلماء کی دختر طیبہ بیگم منسوب ہوئیں ان کے انتقال کے بعد دوسری صاحبزادی ام سلمہ کا عقد ہوا۔ ان کی نسل بھی باقی ہے۔

(تاریخ سلطان العلماء ص ۱۰۵)

سلطان العلماء کی زندگی کے چند اہم واقعات

سلطان العلماء کو اپنی طویل زندگی میں حکومت شرعیہ کے قیام، رقوم زکوٰۃ وخمس کی مستحقین شرعی میں تقسیم اور اسی طرح کے مسائل کے علاوہ بعض نہایت اہم اور دوررس اثرات کے حامل واقعات کا سامنا کرنا پڑا جنھوں نے جناب کی عام مقبولیت کو متاثر کیا۔ یہ واقعات ایسے تھے جن میں فقہ جعفری کے عالم اور پیشوا کی حیثیت سے ان کے لئے راہ عمل وہی تھی جو انہوں نے اختیار کی کوئی بدل ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اس طرح سمجھا نہیں جاسکا جس طرح سمجھا جانا چاہیئے تھا۔

آیئے اب انہیں کسی قدر بسط سے دیکھیں۔

سب سے پہلی منزل تو ہندوستان کے انگریزی عہد میں دارالحرب ہونے کا مسئلہ تھا۔ شاہ عبد العزیز دہلوی اوران کے پیرو ہندوستان کو اس وقت انگریزی راج میں دار الحرب سمجھتے تھے اس لئے جہاد کا سزاوار جانتے تھے۔ فقہ جعفری میں شرائط جہاد کی شدتیں اور سختیاں اتحاد عمل کی راہ میں سنگ گراں تھیں اوراس نے انفرادی طور پرنہیں جماعتی پیمانے پر بعد پیدا کیا۔

سید احمد شہید توان حضرات کے ہم وطن ہی تھے ان کی قربانی نے پورے صوبے کو ہلا کے رکھ دیا مگر وہیں اسی اصول کہ ''غیبت امام میں جہاد نہیں'' کی فقہی پابندی نے شیعہ عناصر کو عملی ہمدردی سے کنارہ کش رہنے پر مجبور کر دیا ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بھی اعلانیہ اور اجتماعی اقدام میں بھی یہی رکاوٹ رہی۔

سلطان عالم واجد علی شاہ کے زمانے میں مسجد اجودھیا کی بے حرمتی اور مولوی امیر الدین علی کی عزیمت نے بھی غلط فہمیاں پیدا کیں۔ عملی اقدام کی حمایت یا شرکت نہیں کر سکتے تھے ایک استفتاء کے جواب میں بہت واضح فتویٰ دیا:۔

''اہل اسلام و ایمان سے کافروں اور لئیموں کے شر کا دفع کرنا حکام اسلام کا فریضہ ہے۔

(مرزا جان: حدیقۃ الشہداص ۱۴۱)

مگر بدگمانی نے اس سیدھے سادھے بالکل بے لاگ فتوے کے معنی پنہائے کہ اس سے قتل سنیاں مقصود ہے، وہ اس پردے میں موجود ہے۔ اس کا سلطان العلماء کیا علاج کرتے!

اسی زمانے میں کچھ پہلے حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفرؔ شہنشاہ ہند نے سلطان العلماء کے نام ایک مراسلہ بھیج کر مذہب شیعہ قبول کرنے کی اطلاع اور درگاہ حضرت عباسؑ میں چڑھانے کے لئے علم مبارک بھیجا اس واقعہ کی ضروری تفصیل آپ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے حقائق نگار قلم سے ملاحظہ کریں:۔

''علم کے قضیے کے متعلق خود مرزا حیدر شکوہ کا بیان ہے کہ جس زمانے میں وہ کلکتے میں مقیم تھے بہادر شاہ ظفرؔ بیمار ہوئے اسی بیماری کی حالت میں انہوں نے ایک خواب میں خود کو حضرت عباسؑ کی درگاہ میں علم چڑھاتے ہوئے دیکھا اور ایک خط میں مرزا حیدر شکوہ کو اس خواب کا حال لکھ بھیجا۔ جب بہادر شاہ کو صحت ہوئی تو انہوں نے

ایک سونے کا علم بنوا کر مرزا حیدر شکوہ کے بھائی میرزا نور الدین کے پاس لکھنؤ بھیجا۔ جب حیدر شکوہ کلکتے سے واپس آئے اور بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اس خواب اور علم کا حال زبانی بھی ان سے بیان کیا اور لکھنؤ کے مجتہد سلطان العلماء مولوی سید محمد صاحب کے نام ایک خط لکھ کر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت روانہ کیا انہیں کے ہاتھ ایک خط مرزا نور الدین کو بھی بھیجا جس میں ان کو لکھا کہ معلوم نہیں کہ علم حضرت عباسؑ کی درگاہ میں چڑھا دیا گیا یا نہیں، اگر نہ چڑھایا گیا ہو تو جلد چڑھایا جائے۔ قصہ مختصر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت بہادر شاہ کا خط وصول ہونے کے بعد مجتہد العصر نے ۶؍ربیع الاول ۱۲۷۰ھ کو وہ علم شاہی انتظام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ حضرت عباس کی درگاہ میں چڑھا دیا۔ یہ خبر کچھ جھوٹے سچے حاشیوں کے ساتھ دہلی پہونچی اور وہاں کے علماء و مشائخ نے بہادر شاہ کو دھمکی دی کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو جمعہ اور عیدین کے نماز کے خطبے سے ان کا نام نکال دیا جائے گا اس خوف سے بہادر شاہ مکر گئے اور یہ ظاہر کیا کہ مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نور الدین نے ان کی بیماری کے زمانے میں ان کی صحت کے لئے اپنے مذہب کے موافق علم چڑھانے کی نذر مانی تھی جس کو انہوں نے اپنے طور پر پورا کیا۔

علم کے قضیے نے بہت طول کھینچا اور اس کے بارے میں بہت خط و کتابت ہوئی اس سلسلے کی تمام اہم تحریریں مرزا حیدر شکوہ نے ایک رسالے میں جمع کر دی ہیں۔ اسی رسالے میں انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کل مغل بادشاہ مذہباً شیعہ تھے اور اس دعویٰ کے کچھ ثبوت بھی پیش کئے ہیں یہ رسالہ ۱۲۷۰ھ میں علم حیدری در عقائد سلاطین تیموری کے نام سے لکھنؤ میں چھپا تھا۔" (نگارشات ادیب ص ۷-۱۹۶)

اس شہرت کے تدارک کے لئے وزیر اعظم حکیم احسان اللہ خاں نے ایک مثنوی مرزا غالبؔ سے کہلوائی۔ اس کا جواب مرزا حیدر شکوہ کے علاوہ میر دوست علی خلیلؔ شاگرد خواجہ آتشؔ نے لکھنؤ سے دیا۔ دہلی میں یہ خیال کیا گیا کہ خلیل کی کوشش میں مفتی علامہ میر عباس شوستری کی مدد شامل ہے۔ اس لئے مولوی امام بخش صہبائی نے جواب کی فکر کی اور اس میں مفتی علامہ پر علانیہ طعن و تشنیع سے کام لیا اب مفتی صاحب نے بھی قلم سنبھالا اور ۱۲۷۱ھ میں ان کی مثنوی خطاب فاصل پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ اس طرح مناظرے کے فن کی یکے بعد دیگرے پانچ مثنویاں وجود میں آئیں۔

مرزا غالبؔ کے سلطان العلماء سے بڑے مخلصانہ روابط تھے۔ مرزا اپنے مذہبی تردداتِ میں جناب کی ہی طرف رجوع کرتے تھے قبلہ و کعبہ بھی دربار اودھ سے ان کی تواضع میں توجہ فرمایا کرتے تھے۔ اس مثنوی کے بعد بھی، جس میں کافی سخت کلامی سے کام لیا گیا تھا، اگرچہ خواجہ حالیؔ کے بیان کے مطابق قبلہ و کعبہ نے مرزا سے دریافت کیا کہ "آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے۔"

(نگارشات ادیب ص ۱۹۷)

لیکن تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا اور مرزا کی جناب سے عقیدت اور مرزا پر جناب کی عنایت سابق بدستور رہی ۔ غالبؔ ان عنایات کا اعتراف سید یوسف مرزا کے نام کے ایک خط میں یوں کرتے ہیں :۔

''سنو صاحب تم جانتے ہو کہ میں چار [4] پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص شالی رومال دوشالہ ایک بار پیشگاہ حضرت سلطان عالم سے پا چکا ہوں ، مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعے سے ملا ہے ۔یعنی جناب قبلہ وکعبہ حضرت مجتہد العصر مدظلہ العالی ۔اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں کہ میں بے ان کے توسط کے مدح گستری کا قصد کروں چنانچہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا میرا دستور ہے، کاغذ کو بنوا کر حضرت پیر ومرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے ۔یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا ۔اور میں تم کو بھی لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھنؤ بھیج دیا ہے اسی خط میں یہ بھی تم کو لکھا ہے کہ حضرت زبدۃ العلماء سید نقی صاحب اگر کلکتے پہنچ گئے ہوں تو مجھ کو اطلاع دو......''

(خطوط غالبؔ مرتبہ مہیش پرشاد ص ۳۔ ۱۶۲)

منشی مہیش پرشاد کی تحقیق کے مطابق یہ خط ۵ رنومبر ۱۸۵۹ء یعنی ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ کی کسی ابتدائی تاریخ کا ہے گویا تصنیف مثنوی کے چھ سال بعد کا اور ابھی مثنوی کا قضیہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا ۔ کیونکہ اسی زمانے میں مفتی صاحب جوابی مثنوی کی تصنیف کر رہے تھے اور کلکتہ ہی میں مقیم تھے ۔اس خط سے اس بات کا بھی ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ خاندان سلطان العلماء کے سبھی نمودار بزرگ غالبؔ پر مہربان تھے ورنہ وہ جناب کے برادر زادے زبدۃ العلماء معین المومنین سید نقی صاحبؒ کے بارے میں اطلاع کیوں منگواتے ۔مثنوی کی تصنیف کے بعد غالبؔ کے حال پر سلطان العلماء کا یہ التفات جناب کی معاملہ فہمی ہی نہیں کشادہ قلبی کو بخوبی واضح کرتا ہے ۔

ان مسائل میں جو سلطان العلماء کی عام مقبولیت پر اثر انداز ہوئے عزاداری کا مسئلہ بھی تھا ۔حدود شرع میں عزاداری کا فروغ غفرانمآب وآل غفرانمآب کا عمومی کارنامہ ہے ۔سلطان العلماء کی خصوصیت یہ ہے کہ طبقۂ علماء کی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے خود ذاکری کی ۔ اس وقت بھی ....مسلمانوں کے ایک چھوٹے مگر بااثر حلقے میں تعزیہ داری بدعت اور اس کے بعض مظاہر شرک کی حد تک شمار کئے جاتے تھے ۔ یہ صورت حال بھی منافی قربت تھی ۔یہی سب مسائل تھے جن سے سلطان العلماء کو مدت العمر سابقہ رہا ۔انگریزی مفاد کے ترجمان تاریخ نگاروں نے انہیں نشانۂ ستم اس لئے بنایا تا کہ انگریزوں کی مداخلت کا جواز ثابت کر سکیں ۔اس کے لئے انہیں نظم و نسق کے ہر شعبے کو ہر پہلو سے بدنام اور رسوا کرنا تھا ۔ان تاریخ نگاروں میں کمال الدین حیدر غالباً ابوطالب اصفہانی کے بعد سب سے اہم شخص ہیں ۔اس لئے ان کی تحریر میں سلطان العلماء کی سیرت پاک کی نسبت سوء ظن کے نہایت ناپاک اشارے پائے جاتے ہیں ۔

سلطان العلماء کی خوش طبعی کے ذکر کے بغیر ان کی شخصیت کا خاکہ مکمل نہیں ہو سکتا ۔اس کے بے

شمار واقعات ہیں جن میں سے چند یہاں پیش کئے جاتے ہیں تا کہ جناب مفتی صاحب کی اس مدح سرائی کی وضاحت ہو سکے ؎

حسن خلق و خوف محشر از جناب شاں نگر
خندہ برلب داشتند و دیدۂ تر داشتند

۱۔ رفیق الدولہ نے کسی تقریب عروسی میں قبلہ و کعبہ کے سامنے طلائی اوگالدان بڑھا دیا۔ آپ نے ان کو غور سے دیکھ کر فرمایا ''ہم سونے اور چاندی پر تھوکتے بھی نہیں۔''

صاحب تاریخ سلطان العلماء تبصرہ کرتے ہیں کہ ''امام اہلسنت (علامہ فخر الدین رازی) نے بھی اپنی تفسیر میں سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر حرمت کی صراحت کی ہے۔

(مفاتیح الغیب ص ۵۹۱ مکتبہ ممتاز العلماء لکھنؤ)

۲۔ پالکی پر تشریف لے جا رہے تھے، کوئی صاحبزادہ ساتھ تھا، کھلونوں کی دوکان دیکھ کر مچل گیا۔ سواری روک کر آپ نے مٹی کے کھلونے خریدے۔ ایک ملائے مسجد کی نظر پڑ گئی۔ حیرت سے کہا ''آپ اور بت پرستی'' فرمایا کہ ''ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کے ہاتھ سے بت شکنی ہو۔''

۳۔ لکھنؤ میں ایک قاری صاحب وارد ہوئے جن کو اپنے فن تجوید و قرأت پر بڑا ناز تھا۔ بار بار کہتے تھے کہ ''جس کا نکاح میں نہ پڑھوں گا وہ صحیح نہ ہوگا'' کسی صحبت میں قبلہ و کعبہ سے ملاقات ہو گئی۔ جناب نے پوچھا کہ ''قاری صاحب آپ کی والدہ کا نکاح کس نے پڑھا تھا'' اس کے جواب میں قاری صاحب نے مستقل خاموشی اختیار کر لی۔

۴۔ نواب فقیر محمد خاں گویا نے ایک معزز عالم کو بھیج کر کہلایا کہ ''آپ شیعوں کے قبلہ و کعبہ کہلاتے ہیں اور لذائذ دنیا میں ایسے منہمک ہیں کہ بغیر متعہ کسی دن چین نہیں آتا؟

ع۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

فرمایا کہ کعبے سے کفر کہاں اٹھا تھا!

۵۔ بعد انتزاع اودھ ایک پادری صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ مسلمانوں میں جہاد کا بڑا رواج ہے۔'' جناب نے فرمایا ''غیبت امام میں جہاد کہاں'' انہوں نے کہا اچھا بعد ظہور تو آپ ہم پر جہاد کریں گے؟ فرمایا کہ ''ظہور حضرت عیسیٰ بھی ہوگا وہ جو ہمیں فرمائیں گے اس پر عمل کریں گے۔''

۶۔ ایک پادری نے کہا: جب امام حسینؑ کو شہید کیا جا رہا تھا تو محبوب خدا نے اللہ سے نہیں کہا کہ اللہ! حسینؑ کو قاتلوں سے بچا لے۔ آپ نے باوقار تبسم کے بعد فرمایا کہ ''محبوب خدا نے خدا سے کہا تھا مگر بارگاہ الٰہی سے جواب ملا آپ نہیں جانتے ان بدبختوں نے میرے بیٹے عیسیٰ کو سولی پر لٹکا دیا جب اپنے فرزند کو میں نہ بچا سکا تو جناب والا کے نواسے کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔''

سانحۂ ارتحال:۔ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں لکھنؤ میں زبردست ہیضہ پھیلا۔ نماز اموات میں

سلطان العلماء کو غیر معمولی تعب کا سامنا ہوا۔ ۲۱ ربیع الاول کو جناب خود مبتلا ہو گئے۔ آخری نماز مغربین جس کا چرچا نصف صدی تک زبانوں پر رہا، اس طرح پڑھی کہ یادالٰہی سے مرض غافل نہ کرسکا۔ تکبیرۃ الاحرام میں دونوں ہاتھ نرمۂ گوش تک، اللہ اکبر کا صحیح تلفظ، تشنج میں کانپتے ہاتھوں کو وقت تکبیر اٹھاتے رہے۔ مگر افسوس شدت مرض نے علامات حیات کو دیر تک جسم میں قائم رہنے نہیں دیا۔ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۸۶۷ء دس بجے رات کو حرارت غریزی مستقر سے خارج ہوئی اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر یہ آفتاب اجتہاد افق ہستی سے ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ (تاریخ سلطان العلماء ص ۱۳۴)

نماز میت ممتاز العلماء فخر المدرسین سید محمد تقیؒ نے پڑھائی۔ مجمع اتنا کثیر تھا کہ نماز جماعت کے لئے امام باڑہ آصف الدولہ کا صحن منتخب کیا گیا تا کہ اگر ضرورت ہو تو شرقی عمارت کی چھت پر صفیں قائم ہو سکیں۔ نماز کے بعد جنازہ امام باڑہ غفرانمآب لایا گیا۔ شہ نشین میں زیر ضریح سپرد خاک کئے گئے۔ تیسرے دن مجلس سیوم ہوئی جس میں سید الذاکرین میر سید علی صاحب نے ذاکری کی۔

شعراء نے قطعات تاریخ میں بڑی دلچسپی لی ہم یہاں چند منتخب تاریخیں پیش کرتے ہیں:

(۱) مفتی میر عباسؒ

سال تاریخ وفاتش را چو می پرسی زمن
آسمانے بود بالا از زمین برداشتند
۱۲۸۴ھ

(۲) منیر شکوہ آبادی

بہر تاریخ وفات آں ملاذ الاصفیا
سال ہجری و مسیحی فکر کردم اے منیرؔ
یافتم در مصرع واحد دو تاریخ این چنیں
وائے خضر عقل کل، ہے ہے امام بے نظیر
۱۸۶۷ء　　۱۲۸۴ھ

(۳) امیر اللہ تسلیم

چو جناب قبلہ عالم زدار بے مدار
شد بجنّت دردلم فکر سن تاریخ گشت
شد طریقت لنگ، بے سر شد شریعت زہد نیر
۹　　۶۸۰　　+ ۳۱۹
سینہ بشگافید و از آرام و تقویٰ درگذشت
۱۰۸۰ - ۵۰۶ = ۷۷۸　　= ۱۲۸۴

(۴)

گفت تسلیم حزیں سال وفات
باز راہ خلد را آباد کرد

(۵) لامعلوم

سنیم من مگر از ان مخدوم
بود چوں جاں یک اعتقاد بدل
زیں سبب درسن وفات دوبار
گفتہ ام ہاں، یک اعتقاد بدل
۶۴۲ × ۲ = ۱۲۸۴ھ

نوٹ:۔ قطعات تاریخ بھی تاریخ سلطان العلماء سے مستفاد ہیں۔

(مضمون مصنف کی کتاب ''امجد علی شاہ'' سے ماخوذ ہے)